# 24

# قرآن کریم دنیا کے ہر ذہنی تغیر کے لئے کافی ہے

(فرمودہ 15 اکتوبر 1943ء بمقام ڈلہوزی)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ 1

یہ مختصر سی آیت قرآن کریم میں ہے جس کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سے اعتراض اور بہت سے غلط خیالات جو لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں دور ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ۔ کہ ہم نے جب کبھی کوئی رسول بھیجا تو اسی زبان میں کلام کرنے والا بھیجا جو اس کی قوم کی زبان تھی۔ اس کے عام طور پر یہ معنی کئے جاتے ہیں اور وہ صحیح معنے ہیں کہ ہر نبی جو آتا ہے اسی زبان میں اپنی قوم کو تبلیغ کرتا ہے۔ اور اسی زبان میں اس پر الہام نازل ہوتا ہے جو زبان اس کی قوم کی ہوتی ہے۔ یہ معنے بھی اپنے رنگ میں مفید ہیں۔ کیونکہ یہ اصولی مسئلہ ہے کہ نبی کی بعثت کی غرض لوگوں کو سمجھانا اور ان کی اصلاح کرنا ہوتی ہے۔ اگر اس کے اوپر مثلاً ایسا کلام نازل ہو یا وہ کسی ایسی زبان میں بات چیت کرے جسے لوگ سمجھ ہی نہ سکیں تو نبی کی بعثت کی غرض کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔ پھر یہ تو ہم مانتے ہیں کہ نبی کی صداقت کی یہ دلیل ہوتی ہے کہ وہ راستباز ہوتا ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک شخص راستباز بھی ہو اور کم عقل یا پاگل بھی ہو۔ اس لئے کوئی مدعیٔ الہام یا مدعیٔ نبوت

صرف راستباز ہونے سے خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا پیغام اور کلام جسے وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرے یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بیوقوف ہو مگر راستباز ہو۔ یا راستباز ہو مگر پاگل ہو۔ پس یہ ضروری ہے کہ مدعی جو کلام پیش کرے اور پھر اس کے جو معنی کرے وہ لوگ سمجھ سکیں۔ ورنہ کیا پتہ ہے کہ جو معنی مدعی نے اپنے الہام کے کئے ہیں اگر اصل الفاظ ایسی زبان میں ہوں جو سمجھ میں نہ آئے تو وہ درست ہیں۔ پس چاہے وہ الفاظ پیش کرنے والا راستباز ہی ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ بھولے پن اور بے علمی سے ایسے معنی کرے جو غلط ہوں۔ احمدی کہلانے والے جو دعویٰ نبوت کرتے ہیں بالعموم وہ راستباز ہوتے ہیں۔ بعض جھوٹے بھی ہیں۔ مگر بالعموم وہ راستباز ہوتے ہیں۔ ہم نے ان کی زندگیوں کو دیکھا ہے کہ وہ سچ بولتے تھے۔ ان کا چال چلن ایسا نہیں تھا کہ جو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فریبی اور جھوٹے تھے۔ اب اگر الہام کے الفاظ کسی ایسی زبان میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے جائز ہوتے جسے کوئی نہ سمجھ سکتا تو ایسے لوگ کچھ چٹ چٹ کر کے کہہ دیتے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ان پر نازل ہؤا ہے۔ اور اس کا یہ مفہوم ہے۔ ایسی صورت میں کوئی ایسا معیار نہ ہوتا جس سے معلوم ہو سکتا کہ فی الواقع وہ الفاظ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں یا نہیں۔ مگر خدا کی کلام کے الفاظ اسی زبان میں نازل ہوتے ہیں جسے نبی کی قوم سمجھے اور اندازہ لگا سکے کہ مدعی پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نازل ہؤا ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ کوئی مدعی ویسے الفاظ گھڑ لے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں اور وہ کہہ دے ان کا یہ مطلب ہے۔

حضرت خلیفہ اول کے زمانہ میں ایک شخص محمد بخش تھا۔ ایک دفعہ اس نے سنایا کہ مجھے الہام ہؤا "آئی وٹ وٹ۔" وہ تھا تو راستباز مگر اس کے دماغ میں جو خرابی تھی اس نے اسے ایسے بے معنی الفاظ سکھا دیے کہ ان الفاظ سے اندازہ لگا لیا گیا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔

پھر قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ نبی اسی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور اسی میں اس پر الہام نازل ہوتا ہے جو اس کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔ مذاہب کی صداقت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے بھی ضروری بات ہے۔ مثلاً آریہ کہتے ہیں کہ وید ایسی زبان میں نازل ہوئے جسے کوئی

نہ جانتا تھا۔ یہ آیت اس کا ردّ بتاتی ہے۔ فرمایا وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ۔ ہم کسی رسول کو نہیں بھیجتے مگر اس کی قوم کی زبان میں تا کہ وہ اس کے سامنے اپنے دعویٰ کی وضاحت کر سکے اور لوگوں کو خدا کا کلام اور تعلیم سمجھا سکے۔

اس آیت کے معنی مفسرین یہ کرتے ہیں کہ نبی کی زبان ہی وہ زبان نہیں ہوتی جو اس کی قوم کی زبان ہوتی ہے بلکہ اس پر نازل ہونے والے کلام کی بھی وہی زبان ہوتی ہے جو اس کی قوم کی ہو۔ اس لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم نکلے گا کہ جو زبان اس قوم کی ہوتی ہے جس کی طرف کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے اسی میں وہ نبی کلام کرتا ہے تا کہ لوگ اندازہ لگا سکیں اس کے سچے اور جھوٹے ہونے کا۔ اور اسی زبان میں اس پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے تا کہ لوگ سمجھ سکیں، اس پر عمل کر سکیں۔ مگر وید کی زبان تو ایسی زبان تھی جسے لوگ جانتے ہی نہ تھے۔ ایسی صورت میں اس کی خوبصورتی، اس کے باریک اشارات، اس کے وسیع مفہوم اور اس کے بلیغ مطالب کو وہ کس طرح سمجھ سکتے تھے۔ وید کے متعلق ایک شخص کا جس پر کہا جاتا ہے کہ وید نازل ہوئے بیان تھا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ ایسی صورت میں اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ وید الہام ہے۔ وہ خود ہی لوگوں سے کہہ سکتا تھا کہ یوں کرو اور یوں نہ کرو۔ الہام کے معنے تو یہ ہیں کہ دوسرے بھی اسے سمجھ سکیں اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن اگر وہ ایسی زبان میں نازل ہو کہ نہ اس کے الفاظ کوئی جانتا ہو، نہ اس کے محاورات سے کوئی واقف ہو، نہ اس کے استعارات کا کسی کو پتہ ہو، نہ اس کے محکمات کی واقفیت ہو، نہ اس کی فصاحت کو کوئی جانتا ہو تو ایسی زبان کے الہام سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

اس آیت کے یہ معنی بھی ٹھیک ہیں کہ نبی اسی زبان میں کلام کرتا اور اسی زبان میں اس پر الہام نازل ہوتا ہے جو اس کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔ مگر لسان کے معنی عربی میں صرف یہ نہیں کہ جو زبان بولی جاتی ہے بلکہ اَور بھی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں فلاں کی زبان بڑی اچھی ہے، فلاں کی زبان بہت فصیح ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ زبان زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور استعمال اور محاورات کے فرق کے لحاظ سے ایک ہی زبان مختلف زبانیں کہلا سکتی ہے۔

پس دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ جو نبی آتا ہے وہ ایسی زبان میں کلام کرتا ہے

جو اس زمانہ کے محاورات کے مطابق ہوتی اور اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے۔ کیونکہ ایسی زبان کا قلوب پر بہت اثر ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بات سے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے متعلق پیشگوئی تھی کہ وہ تمثیلوں میں کلام کرے گا۔ ان تمثیلوں کے معنی زبان کے محاورہ کے مطابق کرنے سے کئی باتیں حل ہو گئیں۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے۔2 یہ اس وقت اس زبان کا محاورہ تھا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام باتیں کرتے تھے کہ مقربِ خدا کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اس محاورہ کی رو سے معلوم ہو گیا کہ حضرت مسیحؑ نے جو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا تو اس کا کیا مطلب تھا۔

پس اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کا یہ مطلب ہے کہ نبی اپنے ملک کی زبان بولتا ہے اور اس کے محاورات میں کلام کرتا ہے۔ مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں "شراب" یا "محبوب" کا جو ذکر آ جاتا ہے ان الفاظ کے معنی لِسَانِ قَوْمِهٖ کے مطابق کئے جائیں گے نہ کہ شراب سے مراد وہ شراب لی جائے گی جسے پی کر لوگ مدہوش ہو جاتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی معرفت کی شراب مراد ہے۔ اور نہ محبوب سے مراد کوئی انسان لیا جائے گا بلکہ خدا تعالیٰ کی ذات مراد ہے۔ کوئی پاگل ہی ان الفاظ کے یہ معنی لے سکتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں شراب سے عام شراب مراد ہے اور محبوب سے کوئی انسان مراد ہے۔

غرض نبی اپنے کلام میں اس زمانہ کے محاورے اور استعارات استعمال کرتا ہے اور ایسی زبان میں کلام کرتا ہے جو اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے۔ ہاں اگر کبھی وہ عام محاورہ کو ترک کرے تو اس کے معنے بھی وہ خود ہی بتا دیتا ہے تا کہ دھوکا نہ لگے۔ مثلاً اس زمانہ میں نبی کے ایک ایسے معنی لئے جاتے تھے جن کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ردّ کیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ نبی وہ ہوتا ہے جو نئی شریعت لائے مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ نبی کے لئے ضروری نہیں کہ نئی شریعت لائے۔ اب آپ کے کلام میں اگر نبوت کا دعویٰ پایا جائے تو نبی کے وہ معنی درست نہیں ہو سکتے جو پہلے لوگ کرتے تھے بلکہ وہی معنی درست ہوں گے جو

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش فرمائے۔ یہ طریق استدلال بالاولیٰ کے طور پر تو استعمال ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں کہ کسی لفظ کے ایسے معنی کئے جائیں جو عام تعلیم، لغت اور محاورہ کے خلاف ہوں۔ ہاں جس لفظ کے متعلق تشریح کر دی جائے اس کے وہ معنی لئے جائیں گے جو اس تشریح کے مطابق ہوں۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نبی کی یہ تشریح فرما دی ہے کہ

من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب

یعنی میں ایسا رسول نہیں ہوں جو نئی شریعت لایا ہوں۔ اس تشریح کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نبی کا لفظ اس زمانہ میں نئی شریعت لانے والے کے متعلق بولا جاتا تھا مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے نبی نہ تھے اور ساری عمر آپ نے ایسا نبی ہونے سے انکار کیا۔ چونکہ یہ مفہوم اس زمانہ کے محاورہ کے خلاف تھا اس لئے آپ نے اس کی تشریح فرما دی۔ تو نبی جس بات کی اصلاح کریں یا جسے کسی ضرورت کے ماتحت بدلیں اس کی ساتھ ہی تشریح کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ نبی کے لفظ کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی۔ تو اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کے اس مفہوم کے ساتھ پرانی الہامی کتابوں کے سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کا جو کلام موجود ہے۔ اگر ان کے زمانوں کے شاعروں، مصنفوں اور زبان دانوں کی کتابیں دیکھیں تو بآسانی حل ہو جاتا ہے اور معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی فلاں بات کا مفہوم کیا ہے۔ پس وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ دوسری کتابوں اور دوسرے مذاہب کے پرکھنے کا ایک بہت اعلیٰ معیار ہے۔

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ نبی اس زبان میں بات کرتا ہے جسے اس زمانہ کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کے لوگوں کی جو عقلی، علمی اور ذہنی حالت ہوتی ہے اس کے مطابق نبی کلام کرتا ہے۔ ہر زمانہ میں لوگوں کی علمی اور عقلی حالت بدلتی رہتی ہے۔ باقی نبیوں کے لئے تو اس میں کوئی مشکل نہ تھی کیونکہ ان کا کلام اسی زمانہ کے لئے ہوتا تھا جس میں نبی مبعوث کئے جاتے تھے اور اس زمانہ کے

لوگوں کی عقلی اور ذہنی حالت کے مطابق ہوتا تھا۔ لیکن اسلام کے لئے یہ امر مشکل تھا کیونکہ اسلام نے قیامت تک جانا تھا۔ اور اس وقت تک لوگ کئی زبانیں بولنے والے تھے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں۔3 عام طور پر لوگوں نے اس حدیث کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مختلف زبانوں کے تغیرات کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنی کھلتے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے لوگوں کو قرآن کریم کی کئی آیات کے وہ معنی نظر نہ آئے جو بعد میں تغیر آنے والے زمانہ کے لوگوں کو نظر آئے۔ اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کے جو نکات اور معارف نکالے وہ قرآن کریم میں نئی آیات داخل کر کے نہیں نکالے۔ آیات وہی تھیں۔ ہاں آپ پر اس زمانہ کے مطابق ان کا بطن ظاہر ہوا۔ چونکہ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور موجودہ زمانہ مذہب کے متعلق امن اور صلح کا زمانہ تھا اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم سے امن کے احکام اور صلح کی تعلیم پیش فرمائی۔ یہ دوسرا بطن تھا جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق آپ پر کھولا گیا۔

پس رسول کریم ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ قرآن کے سات بطن ہیں اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ دنیا میں سات بڑے تغیرات آئیں گے اور ہر تغیر کے زمانہ میں لوگوں کے وقت بدل جائیں گے۔ اس وقت خدا تعالیٰ قرآن کریم کے ایسے معنی کھول دے گا جو لوگوں کے اس وقت کے ذہنوں اور قلوب کو تسکین اور تسلی دینے والے ہوں گے۔ اس زمانہ میں بیسیوں مسائل ایسے ہیں جو ایسے رنگ میں کھلے ہیں کہ پہلے ان کی ضرورت اور اہمیت محسوس نہیں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً آیات قرآنی کے نسخ کا مسئلہ ہے۔ پہلے ایسے وقت میں نسخ کا سوال پیدا ہوا کہ اس وقت کے لوگوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کیونکہ ان کے سامنے رسول کریم ﷺ کا عمل تھا۔ پس باوجود نسخ کے عقیدہ کے یہ بات قرآن کریم کی سچائی کے معلوم کرنے پر روک نہ بن سکتی تھی لیکن جب ایسا زمانہ آیا کہ لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے دور ہوئے اور دنیا کے ذہنی اور علمی تغیر کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنی نہ کر سکے تو کہنے لگے یہ آیت بھی منسوخ ہے اور وہ آیت بھی منسوخ۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کو کھڑا کیا اور آپ نے ثابت کیا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور جن آیات کو منسوخ قرار دیا جاتا تھا ان کے ایسے معنی بیان فرمائے جنہیں لوگوں کی عقلیں بآسانی قبول کر سکتی ہیں اور جو بآسانی ان کے ذہنوں میں آسکتے ہیں۔ یہ ان آیات کا دوسرا بطن تھا جو خدا تعالیٰ نے آپ پر کھولا۔

تو قرآن کریم کے سات بطن سے مراد سات عظیم الشان ذہنی اور عقلی اور علمی تغیرات ہو سکتے ہیں اور اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر ایسے تغیر میں قرآن کریم قائم ہی رہے گا۔ کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ ہمارے زمانہ کی ضروریات کو قرآن پورا نہیں کرتا۔ باقی الہامی کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ جب زمانہ بدلا اور دنیا میں تغیر آیا تو ان کتب میں جو کلام تھا اس کے وہ معنی نہ نکلے جو اس زمانہ کے ذہنوں کے مطابق ہوتے۔ اس لئے وہ قابلِ عمل نہ رہیں۔ مگر قرآن کریم کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جوں جوں دنیا میں تغیر آتے جائیں گے اور لوگ قرآن پڑھیں گے تو اس زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے والا مفہوم اس میں سے نکلتا آئے گا۔ اور لوگ تسلیم کریں گے کہ ہاں قرآن کریم ہی اس زمانہ کے لئے بھی کافی ہے۔ اور محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہی اس زمانہ کے لئے بھی رسول ہیں۔

پھر اَور تغیر ہوگا جس میں آج جو تفسیریں ہم لکھتے ہیں ان کے متعلق اس وقت کے لوگ کہیں گے یہ کیسی فرسودہ باتیں ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کا کوئی بندہ کھڑا ہوگا اور قرآن کریم سے ہی بتائے گا کہ قرآن اب بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح پہلے زمانوں میں قائم تھا۔ اور قرآن کریم کے ایسے حقائق بیان کرے گا کہ یا تو پہلے مفسروں کی غلطی ثابت ہو جائے گی یا پھر اعتراض کرنے والوں کی غلطی نکل آئے گی۔

پھر رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو یہ فرمایا ہے کہ قرآن کے سات بطن ہیں اس سے ضروری نہیں کہ یہی مراد ہو کہ سات ہی بطن ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ دس، بیس، پچاس، سو، ہزار، دو ہزار بطن ہوں کیونکہ عربی میں سات کا لفظ تعدد پر دلالت کرتا ہے۔ خصوصاً کثرت پر۔ تو فرمایا قرآن کو ہم نے ایسا نازل کیا ہے کہ یہ ہر زمانہ کے لئے کافی ہوگا۔ اس میں ہر زمانہ کے خیالات پر بحث موجود ہوگی۔ اگر اس زمانہ کے لوگوں کے خیالات غلط ہوں گے تو ان کی

تردید کی جائے گی اور اگر صحیح ہوں گے تو تائید کی جائے گی۔ تو قرآن کریم ہر زمانہ کے انکشافات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا بھی ایک ثبوت ہے۔ اگر کوئی ایسا زمانہ آئے جب قرآن کریم (نعوذ باللہ) دنیا کی اصلاح کے قابل نہ رہے تو یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا (نعوذ باللہ) ردّ ہو گا۔ لیکن جب قرآن کریم ہر زمانہ کے لئے ہو گا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت بھی ہر زمانہ میں ثابت ہوتی رہے گی۔

پھر خدا تعالیٰ کا عزیز حکیم ہونا بھی انہی معنی کی تائید کرتا ہے نہ کہ ان معنوں کی کہ خدا تعالیٰ نے عربوں میں نبی بھیجا جو انہی کی زبان میں ان سے کلام کرتا تھا۔ کیونکہ عزیز حکیم کا یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ نے وہی بولی بولنے والا نبی بھیجا جو عرب بولتے تھے کیونکہ وہ عزیز حکیم ہے۔ بے شک یہ حقیقت ہے اور ضروری بات ہے کہ نبی وہ زبان بولے جو اس کی قوم کی زبان ہو مگر یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ مثلاً کسی پشتو بولنے والے کے ساتھ مَیں گفتگو کرنے کے لئے میاں خان میر یا نیک محمد صاحب کو بھیج دوں تو گو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ مَیں نے پشتو بولنے والے کے پاس پشتو بولنے والا ہی بھیجا۔ مگر میں اس پر فخر نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مَیں خطبہ پڑھوں اور اس میں کہوں لوگو سنو مَیں ایسا سمجھدار انسان ہوں کہ یہاں ایک پٹھان آیا تھا مَیں نے اس سے گفتگو کرنے کے لئے پشتو بولنے والے کو بھیجا۔ اگر مَیں یہ کہوں گا تو سب لوگ ہنس پڑیں گے کہ یہ کون سی بیان کرنے والی بات تھی۔ ہر شخص ایسا ہی کرتا ہے۔ غرض صرف پہلے معنی کرنے اس جگہ درست نہیں کیونکہ وہ معنی خدا تعالیٰ کے عزیز حکیم ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔ عزیز اور حکیم کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس فعل میں دو باتیں پائی جانی چاہئیں۔ ایک تو حکمت۔ اور جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے حکمت یہ ہے کہ ہر زمانہ کے مطابق اس کلام میں مفہوم پایا جائے گا اور دوسری بات ہے غلبہ۔ کیونکہ عزیز کا لفظ بتاتا ہے کہ وہ غالب ہستی ہے اور یہ غلبہ میرے بیان کردہ تیسرے معنوں کے رو سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ ہی غالب حکمت والا ہے کیونکہ وہی دنیا میں تغیرات آنے

سے ہزار دو ہزار، چار ہزار سال پہلے جانتا تھا کہ یہ یہ تغیر پیدا ہو گا۔ اس لئے اسی نے اپنی حکمت کے ماتحت ایک ہی دفعہ ایسے الفاظ نازل کر دیئے جن سے ہر تغیر کے مطابق مفہوم نکلتا رہے گا۔ اور وہ الفاظ چار ہزار سال، دس ہزار سال بلکہ قیامت تک کے لئے کافی ہوں گے۔

پس ہر تغیر کے مطابق کلام میں مفہوم پیدا کرنا چونکہ ایک عزیز ہستی کا ہی کام ہو سکتا ہے اور قرآن کریم میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ اس لئے معلوم ہوُا کہ وہ عزیز و حکیم ہستی کی طرف سے نازل ہوُا ہے۔ اور انسانی کلام نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک معیار ایسا بیان فرمایا ہے جس کے ذریعہ ہم پہلے انبیاء کے کلام کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور پہلی نبوتوں کے حالات سمجھ سکتے ہیں۔ اور قرآن کریم کی اس عظیم الشان خوبی کو سمجھ سکتے ہیں کہ ہر تغیر افکار کے وقت اس میں سے نیا مفہوم نکلے گا جو اس زمانہ کے لوگوں کے قلوب کی تسلی اور روحانیت کی ترقی کا باعث ہو گا۔ آج ہم نے دیکھا ہے کہ پرانی تفسیریں جن کو پڑھ کر پہلے لوگ سر دُھنتے تھے (اور ان میں اچھی باتیں بھی ہیں) مگر صفحے کے صفحے ان میں ایسے ملتے ہیں کہ جن کو پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کیا رطب و یابس بھر دیا گیا ہے۔ آخر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آکر وہ آیات جن کے معنی ایسے کئے جاتے تھے جو موجودہ زمانہ میں لوگوں کے لئے ٹھوکر کا باعث بن رہے تھے ان کے ایسے معنی پیش فرمائے جو ہمارے ذہن کے مطابق اور دنیا کے ذہن کے مطابق ہیں۔ اور دنیا کے موجودہ مفاسد کو دور کرنے والے ہیں۔ مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ آخری معنی ہیں۔ بے شک حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام آخری خلیفہ ہیں۔ مگر دنیا میں ذہنی تغیرات ختم نہیں ہو سکتے۔ آج سے دو ہزار سال بعد ایسا تغیر ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی ایسے انسان کو کھڑا کرے جو اس تغیر کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنی پیش کرے۔

پس یہ آیت ایک عظیم الشان مسئلہ پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی اسی زبان میں بولتے ہیں جس زبان میں ان کی قوم بولتی ہے کیونکہ یہ تو معمولی سی بات ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے لئے یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ اس لئے لازماً اس آیت کے وہ

معنی بھی ہوں گے جن میں خدا تعالیٰ کا غلبہ اور حکمت پائی جائے۔ اور وہ معنی وہی ہیں جو مَیں نے بیان کئے ہیں۔ ان میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں مگر ان معنوں کی بھی تردید نہیں کرنی چاہیئے جو پہلے لوگ کرتے رہے ہیں ان کو بھی ماننا چاہیئے۔ کیونکہ ان میں بھی صداقت پیش کی گئی ہے۔" (الفضل 11 نومبر 1943ء)

---

1: ابراھیم: 5

2: یوحنا باب 9 آیت 35 تا 37

3: تفسیر الطبری الجزء الاول صفحہ 30 تا 34۔ مطبوعہ مصر 1954ء